مشرکین، یہود، نصاریٰ اور مسلمانوں کے قبلے: ایک تنقیدی مطالعہ

(A Critical Investigation into Prayers Directions of Polytheists, Jews, Christians and Muslims)

☆ صالح الدین حقانی

Abstract

The importance and significance of *ṣalāt* is evident from the sayings and practice of the Prophet (SAW). One of the pre-requisits of *ṣalāt* is facing towards the direction of *Ka'bah* (*qiblah*). It does not imply that Muslims worship the *Ka'bah* or its contents; the *Ka'bah* is simply a focal point for prayers. Allah (SWT) does not possess any place or location; the *Qiblah* is just a code for establishing unity within the Muslims and reviving the reminiscences of monotheism and so, changing it would not transform anything. The important thing is to submit to His commands and shatter the idols of ignorance, stubbornness and egotism. The following paper deeply looks into a comparative study of the history of the change of *qiblahs* in the creeds of Polytheists, Jews, Christians and Muslims with the argument that the *qiblah* determined by the Qur'an is final and based on authentic divine revelation.

تعلیمات نبوی ﷺ سے یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہے، کہ بدنی عبادات میں سے سب سے مہتم بالشان عبادت "صلوٰۃ" کی ہے۔ جن اشیاء پر صحت صلوٰۃ کی عمارت قائم ہے ان میں سے سمت قبلہ کی طرف رُخ کرنا بھی ایک شرط اور رکن کی حیثیت رکھتا ہے۔ لہٰذا زیر نظر عنوان میں، سمت قبلہ کی تعاریف، قبلہ مشرکین، قبلہ یہود، قبلہ نصاریٰ اور قبلہ اہل اسلام کا تقابلی جائزہ پیش کیا جائے گا۔ قبلہ اسلام کی امتیازی خصوصیات، اس کی آفاقیت اور توقیفیت کے حِکَم اور اسرار اس تحقیقی کاوش کا نتیجہ ہو گا۔

سمت قبلہ کی لغوی اور اصطلاحی تعریف

سمت کے لیے عربی لفظ '' جهة ''، مستعمل ہے، جس کے بارے میں صاحب مقاییس اللغۃ لکھتے ہیں:

* پی ایچ-ڈی ریسرچ سکالر، شعبہ اسلامیات، انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اینڈ اریبک سٹڈیز، پشاور یونیورسٹی / لیکچرار، شعبہ اسلامیات، عبدالولی خان یونیورسٹی، مردان

''الواو والجیم والھاء اصل وا حد یدلّ علیٰ مقابلۃ لشیء وا لوجہ مستقبل لکلّ شیء،یقال وجہ الرجل و غیرہ و ربّما عُبّر عن الذات باالوجہ و تقول:وجھی الیک قال استغفر اللہ ذنباً لستُ مُحصیہُ،ربّ العباد الیہ الوجہ والعمل ،وواجھت فلاناً:جعلت وجھی تلقاء وجہہ والوِجھۃ کلُّ موضع استقبلتہ،قال تعالی(وَلِکُل و جھۃ)ووجّھت الشیء ای جعلتہ علی جھۃ''[1]

شہاب الدین القلیوبی رقم طراز ہیں کہ:

''الجھۃلغۃ العین لأن من انحرف عن مقابلۃ شی ءٍ لایقال انہ متوجہ نحوہ ''[2]

قبلہ کی اصطلاحی اور شرعی تعریف

فقہاء کرام نے تصریح کی ہے کہ " قبلہ"سے مراد وہ جگہ ہے جہاں خانہ کعبہ کی عمارت موجود ہے۔ دیکھنے میں تو یہ جگہ تقریباً ۳۳ فٹ چوڑی، ۵۵ فٹ لمبی اور ۴۵ فٹ اونچی نظر آتی ہے مگر اس کی شرافت اور احترام فقط یہیں تک محدود نہیں بلکہ اس کے مقابل عرش اور تحت الثریٰ کے درمیان طویل وعریض سلسلے کو قبلہ کی حیثیت حاصل ہے۔ الغرض قبلہ اس عمارت کا نام نہیں بلکہ مخصوص رقبے کا نام ہے۔[3] لہٰذا:

1. اگر کہیں کعبہ منہدم ہو کر اس کی دیواریں اور چھت وغیرہ دوسری جگہ منتقل کی جائیں اور پھر ان پتھروں کی طرف رخ کر کے نماز پڑھی جائے تو کیا نماز ہو گی؟۔ علامہ کاسانیؒ فرماتے ہیں :

''لأن البناء لا حرمۃ لہ نفسہ بدلیل أنہ لونقل الی عرصۃ اخریٰ وصلی الیھا لایجوز بل کانت حرمتہ لاتصالہ بالعرصۃ المحترمہ'' [4]

کہ منتقل شدہ پتھروں کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنا اس لیے درست نہیں کہ ذاتی طور پر انہیں کوئی احترام اور شرافت حاصل نہیں بلکہ ایک معزز مقام کے ساتھ اتصال اور تعلق کی بناء پر وہ قابلِ احترام قرار پائے ہیں۔

2. اگر کعبہ منہدم ہو کر صرف اس کی جگہ اور رقبہ کی طرف کر کے نماز پڑھی جائے تو بلاشبہ جائز ہے۔ چاہے نماز انفرادی ہو یا باجماعت پڑھی جائے۔ علامہ موصوفؒ اس بارے میں رقمطراز ہیں:

''ولو کانت الکعبۃ منھدمۃ فتحلق الناس حول ارض الکعبۃ وضدوا ھکذا وصلی منفردا متوجھا الی جزء منھا جاز (والدلیل) اجماع الامۃ فان الناس کانوا یصلون الی البقعۃ حین رفع البناء في عھدابن الزبیرؓ حتی بنی البیت علی قواعد الخلیل، وفي عھدالحجاج حین اعادہ الی ماکان علیہ في الجاھلیۃ

وکانت صلوٰتھم مضیۃ بالجواز، وبہ تبین ان الکعبۃ اسم للبقعۃ سواء کان ثمۃ بناء اولم یکن وقد وجد التوجہ الیھا'' [5]

" اگر (خدانخواستہ) کعبہ منہدم ہو جائے اور لوگ اس کی زمین اور جائے وقوع کے اردگرد حلقہ بنا کر یا انفرادی طور پر اس جگہ کے کسی حصے کی طرف منہ کر کے نماز پڑھ لیں تو جائز ہے۔ اور جواز کی دلیل اجماعِ امت ہے کیونکہ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کے دور میں جب کعبہ ڈھایا گیا تو (بناء ابراہیمی کے مطابق اس کی) تعمیر ہونے تک لوگ خانہ کعبہ کی بجائے اس کی محل وقوع کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے رہے۔ اسی طرح حجاج بن یوسف نے جب کعبہ کی عمارت کو تبدیل کر کے اسے دورِ جاہلیت کے مطابق بنایا تو اس موقع پر بھی لوگ دورانِ تعمیر بیت اللہ شریف کے محلِ وقوع کی طرف نماز پڑھتے تھے اور ان کی نمازوں کو جائز ہی کہا جاتا ہے۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ قبلہ دراصل نظر آنے والی مخصوص عمارت نہیں بلکہ اس کی جگہ کا نام ہے۔ چاہے اس جگہ پر وہ عمارت ہو یا نہ ہو"

3. اسی طرح کعبہ کی سیدھ اور محاذاۃ سے کافی زیادہ نشیب وفراز میں بھی اگر نماز پڑھی جائے تو اس کی صحت میں کوئی کلام نہیں کیا جا سکتا۔

علامہ موصوفؒ ہی کا کہنا ہے :

''والدلیل علیہ ان من صلی علی جبل ابی قبیس جازت صلوٰتہ بالاجماع ومعلوم انہ لایصلی الی البناء بل الی الھواء، دل ان العبرۃ للعرصۃ والھواء دون البناء ---'' [6]

" (مذکورہ بالا صورت میں) نماز کے جواز کی دلیل یہ ہے کہ جو شخص "ابو قبیس پہاڑی (جو کعبہ سے کافی اونچی ہے) پر چڑھ کر نماز ادا کرے تو بالاجماع اس کی نماز درست ہوگی، ظاہر ہے کہ یہ شخص کعبہ کی عمارت کی سیدھ میں نماز نہیں پڑھتا بلکہ اس کے اوپر فضا کے سامنے ہو کر نماز پڑھتا ہے۔ اس سے اصل وجہ کی نشاندہی ہوتی ہے کہ کعبہ کے قبلہ ہونے میں عمارت کا اعتبار نہیں بلکہ اس کی جگہ کا اعتبار ہے"

شرعی اور اصطلاحی تعریف کو مد نظر رکھ کر امام رازیؒ آیت کریمہ ''ولکل وجھۃ ھو مولّیھا '' [7] کی تفسیر میں رقمطراز ہیں :

اعلم انّھم ....ذکروافیہ (مصداق کل) اربعۃاوجہ :
''احدھا انہ یتناول جمیع الفرق، اعنی المسلمین والیھود والنصاریٰ والمشرکین وھو قول الاصمؒ قال: لانّ فی المشرکین من کان یعبد الاصنام

ویتقرّب بذالک الی اللہ تعالیٰ کما حکی اللہ تعالیٰ عنھم فی قولہ (ھؤلاء شفعائنا عنداللہ ....)اختلفوا فی المراد من '' وجھۃ'' ....وقال الباقون: المراد منہ امرالقبلۃ....اما قولہ تعالیٰ)ھو مولّیھا) ففیہ وجھان :الاوّل انہ عائد الی الکلّ ای ولکلّ احدوجھۃ ھو مولّی وجھہ الیھا.... ومن قال بھذا التاویل قال: المراد انّ لکلّ من اھل الملل وجھۃ قد اختارھا، أمابشریعۃ واما بھوی''[8]

لفظ کل کی توضیح میں مفسرین کے مندرجہ ذیل چار اقوال ہیں:

''**اول:** اس کو امام اصمؒ نے اختیار کیا ہے،یہ ہے کہ اس سے مراد تمام فرقے ہیں،یعنی مسلمان، یہود، نصاریٰ اور مشرکین (مشرکین کا وجہ ءدخول یہ ہے کہ) ان میں کچھ لوگ ایسے ہیں جو بتوں کی پرستش کو قرب خداوند کا سبب قرار دیتے ہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ ان کی صورت حال بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: (کہ یہ مشرکین بتوں اور غیر اللہ کو پوجتے ہیں اور کہتے ہیں کہ) یہ چیزیں (بت) اللہ کے ہاں ہمارے سفارشی ہیں''

ایسا ہی لفظ ''جہۃ'' کے مصداق میں مفسرین کا اختلاف ہے، حسن بصریؒ کے علاوہ دیگر جمہور مفسرین اس بات کے قائل ہیں کہ اس سے مراد ''قبلہ'' ہے اور آیت کریمہ ''ھو مولّیھا'' کی مندرجہ ذیل دو توجیہات ذکر کرتے ہیں:

پہلی توجیہ یہ ہے کہ ضمیر مرفوع (ہُو) لفظ ''کل'' کی طرف راجع ہے یعنی ہر ایک کا ایک قبلہ ہے جس کی طرف وہ اپنا رخ پھیر تا ہے۔ جو علماء اس تاویل کے قائل ہیں وہ فرماتے ہیں کہ آیت شریفہ کا مفہوم یہ ہے کہ ہر ملت والوں کا ایک قبلہ ہے چاہے شریعت کی بنیاد پر اسے اختیار کیا ہو اور چاہے اغراض اور خواہشات کے سبب۔

گذشتہ آیت اور اس کی تفسیر میں امام اصمؒ[9] کے قول سے یہ بات واضح ہوئی کہ قبلہ سے تعلق رکھنے والے چار قسم کے لوگ ہیں: مشرکین، یہود، نصاریٰ اور اہل اسلام۔ چونکہ کلام الٰہی میں دیگر ادیان والوں کی بہ نسبت مشرکین کے تذکرے کو مقدم رکھا گیا ہے اس لیے یہاں پر بھی شروع ہی میں ان کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

مشرکین اور تعیینِ کعبہ مع نتائج

اس میں شک نہیں کہ کعبہ حضرت آدم علیہ السلام کے زمانے سے صفحۂ ہستی پر موجود تھا بلکہ ان کی پیدائش سے بھی دو ہزار سال پہلے زمین پر فرشتوں کے ہاتھوں کا بنا ہوا خدا کا گھر ہے۔[10] اور اس وقت سے اس کی طرف رخ کر کے صحیح نہج کے مطابق اللہ تعالیٰ کی عبادت ہوتی رہی۔ کسی بت پرستی اور دیگر قبلوں کا کوئی تصور نہیں تھا۔ رفتہ رفتہ جب زمانہ گزرتا گیا یہاں تک کہ حضرت

نوح علیہ السلام کا زمانہ آگیا تو یہ وہ دور ہے جس میں شرک کی سنگِ بنیاد پڑ گئی اور کعبہ کے ساتھ دوسرے قبلوں کا تخیل پیدا ہوا۔ چنانچہ حضرت شاہ اسماعیل شہید صاحب رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں :

> ''دلّت هذه الأيات علىٰ ان الصراع بين التوحيد والشرك بدأ من عهد نوح عليه السلام فمازال رسل الله واتباعهم من الدعاة ينهون عن عبادة غير الله ودعاءه وتعظيمه تعظيما لا يليق الأبالله تعالىٰ وظلّت الحر ب قائمة علىٰ قدم وساق لم تضع اوزارها حتّى يومنا ولن تتوقف فقد أخرج مسلم فى صحيحه ان النبى صلى الله عليه وسلم قال: [لايذهب الليل والنهار حتّى تعبداللات والعزّى۔''[11]
>
> ''(کچھ آیات ذکر کرکے فرماتے ہیں کہ) یہ آیات اس بات پر دال ہیں کہ توحید اور شرک کی آپس میں دست بہ گریبانی حضرت نوح علیہ السلام کے زمانے سے شروع ہوئی جس کی وجہ سے ہمیشہ اللہ تعالیٰ کے پیغمبر علیہم السلام اور ان کے متبعین (جو داعی تھے) غیر اللہ کی عبادت، اس کو پکارنے اور انکی اس طرح تعظیم کرنے سے روکتے رہے جو محض اللہ جلّ شانہ کی شایانِ شان ہو۔ اس لڑائی اور منازعت کا سلسلہ آج تک برقرار رہا اور تاقیامت اس میں انقطاع نہیں آئے گا اس لیے کہ امام مسلم نے اپنی صحیح میں رسول اکرم ﷺ کا یہ ارشاد نقل کیا ہے کہ دن اور رات اس وقت تک ختم نہیں ہونگے ، جب تک لات اور عزّیٰ کی (دوبارہ سے) پرستش نہ کی جائے''

یوں تو مختلف اعتبار سے شرک کی متعدد اقسام اور صورتیں ہیں ، مگر تعیین کعبہ سے تصادم کے پیش نظر فقط بعض اقسام (مثلاًشرک فی العبادت) محل بحث رہے گی۔ ان مشرکانہ پرستشوں کا اگر قرآن کی روشنی میں تجزیہ کیا جائے تو ان کی چند قسمیں سامنے آتی ہیں:

- ملائکہ پرستی۔
- جنّات پرستی۔
- کواکب پرستی۔
- آباء پرستی۔
- جہت پرستی۔

ملائکہ پرستی

مشرکین اپنے لیے بغیر کسی خاص واسطہ کے اللہ کا قرب ناممکن خیال کرتے تھے اسی وجہ سے وہ فرشتوں کو خدا تک رسائی کا وسیلہ بناتے تھے اور ان کی بندگی کرتے تھے۔ اس طرح شرک فی اللوازم یا شرک فی العبادت کی بدعت شروع ہوئی۔ قرآن مجید نے خود ان کی زبان سے ملائکہ پرستی کی یہی توجیہ پیش کی ہے :

''أَلَا لِلَّهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوا مِن دُونِہِ أَوْلِيَاء مَا نَعْبُدُہُمْ إِلَّا لِيُقَرِّبُونَا إِلَى اللَّهِ زُلْفَى''[12]

'' خبردار بندگی صرف اللہ کی ہونی چاہئے اور جن لوگوں نے اللہ کے علاوہ دوست اور حمایتی بنا رکھے ہیں (کہتے ہیں کہ) ہم تو ان کو اس لیے پوجتے ہیں تاکہ ہمیں اللہ کے ہاں قریب کے درجے میں پہنچادیں''

جنات پرستی

ملائکہ کی طرح جنات کو بھی اہلِ عرب بندگی سے مافوق اور زمرۂ الوہیت سے نسبت رکھنے والی مخلوق خیال کرتے تھے۔ قرآن نے ان کے خیال کا ذکر ان الفاظ میں فرمایا :

''وَجَعَلُوا بَيْنَہُ وَبَيْنَ الْجِنَّۃِ نَسَباً وَلَقَدْ عَلِمَتِ الْجِنَّۃُ إِنَّہُمْ لَمُحْضَرُونَ۔ سُبْحَانَ اللَّہِ عَمَّا يَصِفُونَ ''[13]

''اور مشرکین نے اللہ اور جنات کے درمیان رشتہ قائم کر دیا اور جنوں کو تو معلوم ہے کہ تحقیق وہ پکڑے ہوئے آئیں گے۔ اللہ پاک ہے ان باتوں سے جو یہ بتاتے ہیں''

اس بلند نسبت کی وجہ سے لازماً خدائی میں یہ جنات بھی شریک قرار دیئے گئے:

''وجعلوا لله شركاء الجنّ وخلقهم''[14]

'' اور جنات کو اللہ کے ساتھ شریک ٹھہراتے ہیں حالانکہ اللہ نے ان کو پیدا کیا ہے''

زمرۂ الوہیت میں سے خیال جانے کی وجہ سے یہ بھی خیال کیا جانے لگا کہ ان کی رسائی ملأ اعلیٰ تک ہے۔ وہاں سے غیب کی خبریں لاتے ہیں اور کاہنوں کو پہنچاتے ہیں۔ غیب دانی کے شوق میں کاہنوں نے ان سے تعلق قائم کیا اور اس راستے سے ایک خلق کثیر کو انہوں نے سفلی علوم کے فتنوں میں مبتلا کر دیا اور جنوں کی پرستش شروع ہو گئی۔ اسی کی طرف اشارہ ہے:

'' يامعشر الجنّ قد استكثرتم من الانس''[15]

'' اے جنات کی جماعت تم نے آدمیوں میں سے بہت کچھ اپنے تابع کر لیے''

کواکب پرستی

دنیا کی تقریباً تمام بت پرست قوموں میں سورج اور چاند کی پرستش رائج رہی ہے۔ اہل عرب بھی ان کو زمرۂ الوہیت میں خیال کرتے تھے۔ قرآن مجید نے اس کی تردید فرمائی:

'' ومن اٰیاتہ اللیل والنھار والشمس والقمر لاتسجدوا للشمس ولاللقمر واسجدوا اللہ الذی خلقھنّ ان کنتم ایاہ تعبدون'' [16]

'' اور اللہ کی قدرت کے نمونے ہیں رات، دن، سورج اور چاند۔ نہ سورج کو سجدہ کرو اور نہ ہی چاند کو بلکہ اس اللہ کو سجدہ کرو جس نے ان کو بنایا ہے اگر تم اسی کی عبادت کرتے ہو''

اہل عرب ستاروں کی تاثیر کے بھی معتقد تھے ان کا خیال تھا کہ انواء(ستاروں) کو زمین کی خوش حالی میں بڑا دخل ہے۔ بارش کو انہی کے جود و کرم کا نتیجہ سمجھتے تھے۔ بارش ہوتی تو کہتے '' مطرنا بنوء کذا'' فلاں ستارہ خوب برسا'' اور یہ نسبت ان کے نزدیک کوئی مجازی نہیں ہوتی تھی بلکہ وہ فی الحقیقت اس بات پر ایمان رکھتے تھے کہ پانی برسانا ستاروں کا کام ہے۔ مشہور ستارہ '' شعریٰ'' بھی اہل عرب کا معبود تھا۔ اس موقع پر بھی قرآن کریم نے ان کی تردید کی:

'' وانہ ھو ربّ الشعریٰ'' [17]

''اللہ ہی شعریٰ ستارے کا رب ہے''

شعریٰ غریب بھی ایک ادنیٰ مزدور کی طرح اس کا حکم بجالاتا ہے۔ اس میں مستقل طور پر کچھ بھی تاثیر نہیں۔

آباء پرستی

دیوتاؤں کی بزم (جو اپنے معبودوں کی خاص خاص مرتبے دینے کے لیے منعقد ہوتی تھی) میں انہوں نے اپنے آباء واجداد میں سے ان بزرگوں کو جگہ دی جن کے مذہبی تقدّس کی روایات ان میں پھیلی ہوئی تھی۔ ان کی '' قبریں'' اور ان کے ''آثار'' حصولِ برکت و قبولیتِ دعا کے مرکز بنتے بنتے بالآخر معبد بن گئے اور آہستہ آہستہ ان کے متعلق بھی انہوں نے اس طرح کے عقائد اور تصورات قائم کرلیے جس طرح کے عقائد اور تصورات انہوں نے جنات اور ملائکہ کے متعلق قائم کرلیے تھے۔ قرآن پاک نے اس کی تردید فرمائی:

''وَالَّذِیْنَ یَدْعُونَ مِن دُونِ اللّٰہِ لاَ یَخْلُقُونَ شَیْئاً وَہُمْ یُخْلَقُونَ۔ أَمْواتٌ غَیر أَحْیَاء وَمَا یَشْعُرُونَ أَیَّانَ یُبْعَثُونَ'' [18]

'' اور جن کو پکارتے ہیں خدا کے سوا، کچھ پیدا نہیں کرسکتے اور وہ خود پیدا کیے ہوئے ہیں۔ مردے ہیں جن میں جان نہیں اور نہیں جانتے کہ کب اٹھائے جائیں گے''

پس جس چیز کا وجود دوسرے کا عطا کیا ہوا ہو اور وہ جب چاہے چھین لے، اسے خدا کس طرح کہہ سکتے ہیں؟ یا عبادت کے لائق کیسے ہو سکتی ہے؟

جہت پرستی

ان مشرک اقوام میں مجموعی طور پر ایک مشترک گمراہی یہ بھی رہی ہے کہ خدا چونکہ متمکن اور مجسم ہے (نعوذ باللہ) اس لیے لازم ہے کہ اس کی ہستی کسی نہ کسی متعین سمت اور جہت میں ہو اور اس تلبس اور تعلق کی بناء پر خود وہ سمت اور جہت مقدس ہے۔ مصری، ہندی اور رومی غرض تمام مشرک قوموں نے خدا کو کسی نہ کسی جہت میں فرض کرکے خود اسی جہت کو بھی مقدس گردانا ہے۔ اور چونکہ سورج دیوتا کا مرتبہ مذاہب شرکیہ میں عموماً اہم اور مقدّم رہا ہے (جیسا کہ اجمالاً اوپر گزر بھی گیا) اس لیے شاہِ خاور (سورج) کے طفیل سمتِ مشرق ہی عموماً مقدس سمجھی گئی اور دنیا کے اکثر علاقوں میں پجتی رہی۔

مشرق پرستی سے تو بہرحال کم اور بہت ہی کم لیکن پھر بھی ایک عام اور وسیع وباء مغرب پرستی کی بھی شرک کی دنیا میں رہ چکی ہے۔ آفتاب کے طلوع وغروب پر قیاس کرکے مشرک ذہنیت نے یہ نتیجہ نکالا کہ مصدرِ حیات جیسے سمتِ مشرق ہے اسی طرح مستقرِ موت واجل سمتِ مغرب ہے اور یہ بھی مستحقِ تعظیم وتقدیس ہے۔ اس مشرق پرستی اور مغرب پرستی کا تذکرہ قرآن پاک کی اس آیت میں ملتا ہے:

''لیس البرّ ان تولّوا وجوھکم قبل المشرق والمغرب'' [19]

''نیکی کچھ یہی نہیں کہ تم اپنا منہ مشرق یا مغرب کی طرف پھیر دو''

آیتِ کریمہ میں اگرچہ فقط مشرق اور مغرب کا ذکر ہے مگر مقصود تمام سمتوں کی تعمیم ہے، انہی دو سمتوں کی تحدید یا تخصیص نہیں۔ علامہ آلوسی بغدادیؒ فرماتے ہیں:

''والمراد من ذکر المشرق و المغرب التعمیم لاتعیین السمتین'' [20]

''کہ مشرق اور مغرب کو ذکر کرکے جہات کی تعمیم مقصود ہے فقط انہی دو جہتوں کی تخصیص سطحِ نظر اور نصب العین نہیں''

یہود، تعیین کعبہ اور اس کے نتائج

تاریخ کے حوالے سے یہ ایک مسلم اور ناقابل انکار حقیقت ہے کہ یہود اگرچہ ابتدائی دور میں اللہ کی وحدانیت کے قائل تھے مگر بعد میں شرکی عناصر ان میں سرایت کر گئے جس کی وجہ سے ان کا کافی حصہ دائرہ توحید سے نکل کر شرک کا جھنڈا اٹھانے اور لہرانے لگا، یہی دور جاہلیت ثالثہ کہلاتا ہے [21]۔

شرک کا یہ دلدادہ طبقہ گویا جہت پرست مشرکین کا ہم مشرب ہے۔ انہیں اگرچہ ایک زمانے میں اپنی توحید پر ناز تھا مگر افسوس کہ مشرکین کے زہریلے اثرات سے محفوظ نہ رہ سکے بلکہ ان کے بعض فرقے تو پوری طرح مشرق پرستی کی صف میں آ گئے اور بعض قوموں نے مشرق کے جوڑ پر مغرب کے تقدّس کا کلمہ پڑھنا شروع کیا۔ انہوں نے دیکھا کہ مشرق اگر خطۂ حیات ہونے کی بناء پر مقدس ہے تو مغرب بھی خطۂ موت اور دیارِ ہلاکت ہے شاہِ خاور (سورج) ادھر سے اگر طلوع ہوتا ہے تو روزانہ غروب اور فناء تو ادھر ہوتا ہے پھر اس کے تقدس کا بھی کیوں نہ قائل ہو لیا جائے چنانچہ یہ دونوں سمتیں ان کے ہاں بھی خوب پجتی رہیں۔ مشرق زیادہ اور مغرب اس سے کچھ کم۔ [22]البتہ توحید کے دعویدار یہود باوجود توحید کے اور باوجود استقبالِ کعبہ پر مامور ہونے کے قبلۂ ابراہیمی سے منحرف رہے۔ مجموعی طور پر تین قبلے ایسے ذکر کئے جاتے ہیں جن سے ان کا سابقہ پڑا:

(الف) بیت المقدس۔

(ب) کچھ زمانے کے لیے تابوت۔

(ج) اور ملک شام میں واقع "طور پہاڑ"۔ تینوں کی تفصیل اور ضروری وضاحت کچھ یوں پیش کی جاتی ہے۔

بیت المقدس

یہود کے مختلف اصناف کے قبلوں میں سے ایک قبلہ بیت المقدس رہا ہے جو کہ اب بھی ہے۔ چنانچہ مفسرین نے آیت ''ومابعضهم بتابع قبلة بعض'' کے ذیل میں لکھا ہے:

"لأن اليهـود يستقبل بيت المقـــدس وهـو فى المغـرب مـــن المـــدينة" [23]

"یہود بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے ہیں جو کہ مدینہ سے مغرب کی جانب واقع ہے"

خود ان کی زبانی بات ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے دین میں تو ہم سے مخالف ہیں مگر قبلہ اختیار کرنے میں ہماری متابعت کرتے ہیں۔ [24] (اس لیے کہ اس زمانے میں بیت المقدس قبلۂ عبادت تھا اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس کے استقبال پر مامور تھے)

تابوت

قبلۂ یہود کے متعلق علامہ ابن قیمؒ نے جو تحقیق کی ہے اس میں یہود کا اصل قبلہ تابوت قرار دیا ہے۔ علامہ آلوسیؒ اس کو نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''ان قبلۃ الطائفتین الاٰن لم تکن بوحی وتوقیف من اللہ تعالیٰ بل بمشورۃ و اجتھاد منھم.....اماالیھود فکانوا یصلون الیٰ التابوت الذی معھم اذاخرجوا،واذاقدموا بیت المقدس نصبوہ الیٰ الصخرۃ وصلواالیہ فلمارفع اجتھدوا فأدّی اجتھادھم الیٰ الصلوٰۃ الیٰ موضعہ وھو الصخرۃ ولیس فی التوراۃ أمر بذالک ''[25]

''موجودہ دور میں یہود و نصاریٰ کے جو قبلے ہیں ان کی تعیین ''وحی '' اور'' اللہ تعالیٰ کے بتانے '' سے نہیں ہوئی ہے بلکہ خود انہوں نے سوچ وبچار کرکے متعین کئے ہیں..... چنانچہ یہود کی صورتِ حال تو یہ رہی کہ جب وہ بیت المقدس سے باہر ہوتے تو اس صندوق[26] کی جانب اس (صندوق) کو کھڑا کرکے وہی عبادت تصور کرتے''

(الغرض سفر و حضر دونوں میں اسی صندوق کی طرف منہ کرکے نماز پڑھا کرتے تھے لیکن فرق صرف اتنا تھا کہ سفر میں جہاں کہیں اس کو رکھنے کی نوبت آتی وہیں رکھ دیتے مگر واپسی پر اس کے رکھنے کا ایک خاص مقام تھا یعنی چٹان کے قریب۔) پھر جب وہ ان سے اٹھالیا گیا[27] تو انہوں نے فیصلہ کیا کہ تابوت نہ سہی اس کی جگہ تو موجود ہے۔ آیئے اسی جگہ (صخرہ، چٹان) کو سمت عبادت قرار دیتے ہیں۔ یہ وہ دور ہے جس میں صخرۂ بیت المقدس یہود کا قبلہ قرار پایا۔

تو اصل میں ان کا قبلہ یہی صندوق تھا۔ اگرچہ یہ بھی انہی کی تجویز کا مرہون منت تھا۔ پھر اس کے چھن جانے کے بعد بیت المقدس کی چٹان کو یہ حیثیت ملی جبکہ یہ بھی محض خیال وقیاس کا نتیجہ ہے۔ اس کو نقل کرکے علامہ آلوسی بغدادیؒ نے ایک اشکال ذکر کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

''ولوصح ھذان القولان یشکل علیھما بأن عادتہ تعالیٰ تخصیص کل شریعۃ بقبلۃ ''[28]

کہ اگر بالفرض والتقدیر اس تحقیق اور نظریئے کو صحیح قرار دیا جائے تو پھر لازم آتا ہے کہ یہود اور نصاریٰ کی اپنے زمانے کے لحاظ سے جو برحق شریعتیں تھیں ان میں منجانب اللہ قبلے کا کوئی تصور ہی نہیں تھا۔ اور اس کے بارے میں کوئی حکم ہی نہیں آیا تھا حالانکہ اللہ تعالیٰ کی عادت مبارکہ یہ ہے کہ ہر شریعت والوں کو

(بشرطِ حقانیت) کسی نہ کسی قبلے کے ساتھ ضرور خاص کر دیتے ہیں۔ (مگر یہ تفریع چونکہ عادتِ الٰہیہ سے متصادم ہے اس لیے علامہ موصوف کی یہ تحقیق قابل قبول نہیں۔)

علامہ آلوسی بغدادیؒ کا یہ اشکال کافی وزنی ہے مگر تامل اور عمیق نظر کے بعد یہ کہنا بے جا نہیں کہ " علامہ ابن قیمؒ " کے کلام کی دونوں شقیں قابل اعتراض نہیں بلکہ محض شق ثانی محل نظر ہے کیونکہ علامہ موصوف نے جو نصاریٰ کا موجودہ قبلہ (سمت مشرق) اجتہادی قرار دیا ہے اس سے انکار کی گنجائش نہیں۔ البتہ یہود کے موجودہ قبلے (بیت المقدس) کے متعلق یہ کہنا " کہ وہ ان کے اجتہاد اور اختراع کا نتیجہ ہے اور وحی الٰہی سے اس کی تقرری نہیں ہوئی ہے " یہ بات حقیقت کے موافق نہیں بلکہ اس کے مخالف معلوم ہوتی ہے اس لیے کہ بیت المقدس گذشتہ انبیاء علیہم السلام کا قبلہ رہا ہے چنانچہ علاّمہ علاء الدینؒ آیت (الذی بٰرکنا حولہ) کے ذیل میں تحریر فرماتے ہیں:

''وقیل سماہ مبارکا لأنہ..... قبلۃ الأنبیاء قبل نبینا محمد □ ''[29]

" بیت المقدس کو اس لیے مبارک کہا گیا ہے کہ وہ حضرات انبیاء علیہم السلام کے لیے اسے قبلہ ٹھہرانا ایک واضح دلیل ہے کہ ان کی امتوں کے لیے بھی وہ قبلہ تھا۔ اور منجملہ دیگر امم کے ایک امت اور قوم یہود بھی ہے پس کیوں کر ان کے لیے بیت المقدس قبلہ نہ ہو؟

شیخ جمال الدین قاسمیؒ فرماتے ہیں:

"الذی بٰرکنا حولہ .... وھو قبلۃ الصلوٰۃ فی الملتین وفی صدر الاسلام بعد الھجرتین ''[30]

"بیت المقدس یہودی اور عیسائی مذہبوں میں نیز (حبشہ اور مدینہ کی طرف) ہجرت کرنے کے بعد اسلام کے ابتدائی دور میں بھی (اصح قول کے مطابق سولہ مہینے اور کچھ ایام تک) قبلہ رہا ہے"[31]

مذکورہ بالا چند سطور سے یہ بات بخوبی واضح ہوتی ہے کہ یہود کے موجودہ قبلے (بیت المقدس) کو اختراعی سمجھنا حقیقت سے ہم آہنگ نہیں بلکہ حکمتِ الٰہی، احادیث اور مفسرین کے اقوال کا مقتضا اس کے برعکس ہے۔

علاوہ ازیں علامہ ابن قیمؒ کے کلام کی شق ثانی کا اگر یہ مطلب لیا جائے کہ بیت المقدس اگرچہ انبیاء سابقینؑ کا قبلہ رہا ہو اور بذریعۂ وحی ان کے لیے اس کا تقرر ہوا ہو مگر ان کی امتوں کو اس حکم سے مستثنیٰ رکھا گیا تھا اور بعد میں خود انہوں نے اپنے تدبیر اور اجتہاد سے اس کا انتخاب کیا۔ یہ مطلب بھی قرین قیاس نہیں۔ آخر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام کو تو کوئی حکم از

قبیل عبادت ملے اور ان کی امتیں اس حکم سے مستثنیٰ رکھی جائیں؟ بالخصوص جبکہ اس حکم میں انبیاء علیہم السلام کی کوئی تخصیص بھی نہ ہو۔

طور پہاڑ

یہودیوں میں جو سامرہ طبقہ ہے وہ (علامہ ابن قیمؒ کی تحقیق کے مطابق) ملک شام میں نابلس بستی کے قریب واقع " طور پہاڑی" کو قبلہ مانتے ہیں۔[32]

قبلۂ یہود اور اس کی حقیقت

1. یہود کے سامرہ طبقے کا متعین کردہ قبلہ جو طور پہاڑی ہے، کسی بھی زمانے میں حکم خداوندی کے تحت مقرر نہیں ہوا ہے۔ یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ مشرق اور مغرب سب اللہ ہی کے ہیں۔ وہ چاہے تو کسی بھی جگہ کو قبلہ بنا سکتے ہیں۔ مگر امکان اور وقوع علیٰحدہ علیٰحدہ چیزیں ہیں جن میں کوئی تلازم نہیں۔ پس وقوع کے لحاظ سے دیکھا جائے تو کسی بھی شریعت میں اس (طور پہاڑی) کو قبلہ قرار دینے کی نوبت نہیں آئی۔ بلکہ قبلہ یا تو کعبہ رہا ہے یا پھر ایک زمانے تک بیت المقدس۔ اس لیے گذشتہ طبقے کا طور پہاڑی کو قبلۂ عبادت ٹھہرانا محض خوش فہمی، اتباعِ نفس پر مبنی اور ہدایت کے راستے سے دور کی بات ہے۔ جس کی طرف اس آیت سے اشارہ ملتا ہے:

   ''أفرأيت من اتخذ الٰهه هواه''[33]

   "بھلا دیکھا اس شخص کو جس نے اپنی خواہش کو معبود بنا رکھا"

2. علاوہ ازیں جو یہود حضور ﷺ کے زمانے میں بیت المقدس کو قبلہ مانتے تھے یا اب اس کے قائل ہیں انہیں ہرگز وحی کی تائید حاصل نہیں بلکہ قرآن کریم تو جگہ جگہ صراحۃً یا اشارۃً ان کی تردید کرتا ہے۔ چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

   ''ولئن أتيت الذين أوتوا الكتٰب بكلّ اية ماتبعوا قبلتك''[34]

   " اگر آپ اہلِ کتاب کے پاس تمام نشانیاں (جن کا وقوع ممکن ہے) لے آئیں جب بھی تمہارے قبلہ کو نہ مانیں گے "

دیکھئے! حضورِ اکرم ﷺ کا قبلہ (کعبہ) تو حق ہے۔ جب یہود اس حق قبلہ کو تسلیم نہیں کرتے تو لازمی بات ہے کہ پھر باطل کی طرف دوڑیں گے۔

''فماذا بعدالحق الاالضلال''[35]

" سچ کے بعد جھوٹ اور گمراہی کے علاوہ اور کیا ہے؟"

اسی طرح فرمایا:

''ومـــاأنت بتـــابع قبلتهم''[36]

''(اے نبی ﷺ) آپ کسی بھی وقت ان کے قبلہ کا اتباع نہیں کر سکتے''

پس اگر اس آیت کے نزول کے وقت بیت المقدس واقعی قبلہ ہوتا اور اس میں کچھ خیر ہوتی تو کیسے اللہ تعالیٰ اس سے منع فرماتے؟ اور کس طرح حضور ﷺ اس کا اتباع نہ فرماتے؟ حالانکہ نیکی کے کاموں میں حضور ﷺ سے بڑھ کر کوئی نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ منسوخ ہو چکا ہے اور تا قیامت یہی حکم رہے گا۔

''ومـــا بعضهم بتابع قبـــلة بعض''[37]

اہل کتاب تو خود ہی ایک دوسرے کا قبلہ نہیں مانتے۔ (یہود کا قبلہ صخرۂ بیت المقدس اور نصاریٰ کا قبلہ بیت المقدس کی شرقی جانب ہے۔ جہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی روح پھونکی گئی تھی) سو (وحی کے مقابلہ میں) ان کا متعدد قبلے بنانا ہی ان کی تردید کے لیے کافی ہے۔ کیونکہ ہدایت کی بات تو ایک ہی ہوتی ہے۔ اور ہدایت کے مقابلہ میں شاخ در شاخ اور دوغلے کام فاسد عقل کے اتباع ہی کے نتائج ہوا کرتے ہیں۔ آگے ارشاد ہے:

''ولئن اتبعت أهواءهم من بعد ماجاء ك من العلم انک اذالمن الظالمين''[38]

'' اگر آپ ان دلائل کے بعد بھی ان کی خواہشات پر چلیں گے تو بیشک آپ بے انصافی کرنے والوں میں سے ہوں گے''

اس فرمان میں اگر ایک طرف استقبال کعبہ کے لیے علم الٰہی کو پیش خیمہ ثابت کیا ہے تو دوسری طرف اس (کعبہ) کے علاوہ کسی بھی قبلہ کو (جس میں بیت المقدس بھی شامل ہے) اختیار کرنا حضور ﷺ کی شان میں اتباع ھوٰی کے مترادف اور بے انصافی کا باعث قرار دیا ہے۔

دراصل جب حضور ﷺ مکہ سے مدینہ تشریف لے گئے تو سولہ سترہ مہینے بیت المقدس ہی کی طرف نماز پڑھتے رہے۔ اس کے بعد جب استقبالِ کعبہ کا حکم ہوا تو چونکہ اس وقت بیت المقدس کو چھوڑنا ہی پڑا جو یہود کو ناگوار گزرا اس لیے انہوں نے (نیز اسلام کے دیگر مخالفین نے) اس پر اعتراضات شروع کیے۔ مگر قرآن نے یہاں پر بھی اپنا اسلوب قائم رکھ کر حق و باطل کو واشگاف کر دیا۔ چنانچہ حضور ﷺ اور ان کے متبعین کو تو ''يَهْدِي مَنْ يَشاءُ الیٰ صراط مُّسقَيِم'' کا مصداق یعنی ہدایت یافتہ قرار دیا جبکہ ''سَيقُول اَلسفهاء'' کہہ کر یہود وغیرہ معترضین کو بیوقوف، نادان، احمق اور جاہل ٹھہرایا۔

تعیین کعبہ کی بابت تصور عیسائیت اور اس کے نتائج

عیسائیوں کا اصل قبلہ بیت المقدس ہی تھا۔ ان کے مقتدا سیدنا عیسیٰ علیہ السلام اسی کی طرف نماز پڑھا کرتے تھے۔ علامہ آلوسی بغدادیؒ آیت ''وَمَاَ اَنْتَ بِتابِعٍ قِبلَتْہُم '' کے تحت لکھتے ہیں:

''وقد یقال ان الا فراد بناء علیٰ ان قبلۃ الطائفتین الحقۃ فی الأصل بیت المقدس وعیسی علیہ السلام لم یصل جھۃ الشرق حتی رفع وانما کانت قبلتہ قبلۃ بنی اسرائیل الآن ''[39]

'' آیت بالا میں لفظ قبلہ کو (باوجود یہ کہ اس کی نسبت یہود و نصاریٰ دونوں کی طرف کی گئی ہے اور ان کے قبلے متعدد ہیں (مفرد اسی لیے لایا گیا ہے کہ اصل میں یہود و نصاریٰ دونوں کا قبلہ بیت المقدس ہی تھا۔ اور)اگر عیسائیوں کی مشرق پرستی سے کسی کو حضرت مسیح علیہ السلام کے متعلق استقبال مشرق کا تو ہم ہوتا ہو، تو حقیقت یہ ہے کہ (حضرت مسیح علیہ السلام نے بوقت نماز مشرق کی جانب رخ کیا ہی نہیں تھا۔ ان کا قبلہ تو بنی اسرائیل کا موجودہ قبلہ یعنی بیت المقدس تھا''

سمت مشرق سے ترجیحی سلوک کے کچھ اسباب

1. سیّدنا عیسیٰ علیہ السلام کو جب دنیا سے اٹھالیا گیا تو عیسائیوں میں سے شیوخ، اہل علم اور عمر رسیدہ لوگوں نے استقبال مشرق کی بنیاد ڈالی۔ اور اپنی براءت اور سبکدوشی کی خاطر یوں کہنے لگے کہ دراصل سیّدنا عیسیٰ علیہ السلام نے حرام کو حلال اور حلال کو حرام قرار دیا، نیز دیگر احکام کو شریعت کے نام سے خاطر خواہ جامہ پہنانا ہمیں سپرد کیا ہے، پس جو کچھ ہم حلال یا حرام ٹھہرائیں گے تو ایسا ہے جیسا کہ خود سیّدنا عیسیٰ علیہ السلام نے آسمان میں اسے حلال یا حرام قرار دیا ہو۔ اس کے ساتھ ساتھ عوام کو یہ فریب بھی دیا کہ سمتِ مشرق میں کچھ ایسے چھپے ہوئے (بھلائی کے) بھید ہیں جو کسی دوسری سمت میں نہیں ۔یہی وجہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی جائے پیدائش (حضرت مریم علیہا السلام کے مقام رہائش سے) مشرقی سمت میں تھی جیسا کہ آیت '' اذا انتبذت من أھلھا مکاناشرقیاً ''[40] سے معلوم ہوتا ہے۔

مشرق سے ترجیحی سلوک کا ایک سبب (اپنے باطل دعویٰ کے مطابق) یہ بھی بیان کیا کہ حضرت مسیح علیہ السلام جب سولی پر چڑھائے جارہے تھے تو اس پریشانی اور مشکل کے عالم میں بھی انہوں نے مشرق سے منہ نہیں پھیرا جس سے سمت مشرق کی بے پناہ عظمت اور تقدس معلوم ہوتا ہے۔ اور اسی لیے استقبال کے لائق ہے۔ اور بقول صاحب روح المعانی:

2. '' ان بعض رھبانھم قال لھم انی لقیت عیسیٰ علیہ السلام فقال لی: ان الشمس کوکب احبہ یبلغ سلامی فی کل یوم فمرقومی لیتوجھوا الیھا فی

صلاتهم فصدقوا وفعلوا ويؤيد ذالك انہ ليس فی الانجيل استقبال الشرق''[41]

" ایک راہب نے عوام عیسائیوں سے کہا کہ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے ملا تو مجھ سے فرمایا کہ سورج میرا پسندیدہ ستارہ ہے جو روزانہ میرا سلام پہنچاتا ہے، لہٰذا میری قوم سے کہہ دیجئے کہ نماز میں اس (سورج) کی طرف رخ کرلیا کریں۔ اس پر انہوں نے اس راہب کی عملاً تصدیق کی اور یوں استقبال مشرق کا آغاز ہوا"

راہب کی اس حکایت کے خود ساختہ اور من گھڑت ہونے کی دلیل یہ ہے کہ (اگر واقعی یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا بتایا ہوا اللہ کا حکم ہوتا تو انجیل میں اسے موجود ہونا چاہئے تھا حالانکہ) انجیل میں مشرق کی طرف منہ کرنے کا سرے سے تذکرہ ہی نہیں۔ علامہ ابن قیمؒ کی تحقیق بھی اس کے قریب قریب ہے۔[42]

3. حضرت مسیح علیہ السلام کے چند ہی سال بعد مسیحیوں میں پولوس نامی ایک شخص آگھسا (جسے ایک دنیا آج سینٹ پال کے نام سے یاد کرتی ہے) اور اس نے مسیحیت کا رخ بجائے تجدید موسویت کے ایک مستقل تثلیثی شرک کی طرف پھیر دیا۔ رومی اس وقت حاکم قوم تھی اور جیسے آج دنیا کے ہر شعبۂ زندگی میں انگریزیت کا بول بالا ہے اس وقت بھی محکوموں کے دلوں میں رومی مشرکوں ہی کے علوم وفنون، تہذیب وتمدن اور دین ومعاشرت کا تسلط چھایا ہوا تھا۔ اور رومی مذہب کا ایک جزء چونکہ آفتاب پرستی بھی تھی اس لیے پولوسی مسیحیوں نے جہاں اور بہت سے مراسم رُومیوں سے دھڑا دھڑ اخذ کئے وہیں اس مشرق پرستی کو بھی ان سے لے لیا اور مشرق کی طرف منہ کرکے عبادت کرنے لگے۔ چنانچہ مسیحیوں کے گرجے آج تک بہ جہت مشرق چلے آتے ہیں۔[43]

قبلۂ عیسائیت اور اس کی حقیقت

عیسائی دنیا میں جو دو قبلے قابل احترام رہے ہیں اور اب بھی ہیں (جہت مشرق اور سمت مغرب) ان کے متعلق پہلے گزر چکا ہے کہ ان کی بنیاد کون بنا؟ راہب یا عمر رسیدہ اہل علم لوگ یا پھر پولوس جو آج سینٹ پال کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ بہر کیف کعبہ کو چھوڑ کر مشرق یا مغرب کو قبلہ قرار دینا کوئی منجانب اللہ حکم نہیں بلکہ گمراہ انسانوں کی منصوبہ بندی اور تلبیس شیطانی ہے اور ظاہر ہے کہ جب وحی الٰہی اور انبیاء علیہم السلام کو چھوڑ کر ان جیسے لوگ مقتدا بنائے جائیں تو ان کے پیروکاروں کا کیا حال ہوگا؟

''ليس البرّ أن تولّوا وجوهكم قبل المشرق والمغرب''[44]

" نیکی کچھ یہی نہیں کہ تم مشرق یا مغرب کی طرف منہ کر دو"

دوسرے مقام پر قرآن اہل کتاب (یہاں نصاریٰ مراد ہیں) کے قبلہ کی تردید کرتے ہوئے کہتا ہے: ''وما أنت بتابع قبلتهم ''[45] جس کا ظاہری مفہوم تو یہ ہے کہ حضور ﷺ اہل کتاب کے قبلہ کا اتباع نہیں کریں گے مگر علامہ آلوسیؒ[46] اس آیت کے ذیل میں ایک لطیف نکتہ اٹھا کر فرماتے ہیں:

افرد القبلۃ وان کانت مثناۃ اذاً للیهوٰ قبلۃ وللنصاری قبلۃ لأنهما اشترکتافی کو نهما باطلتین فصار الاثنان واحداً من حیث البطلان ''[47]

کہ آیت بالا میں لفظ قبلہ کو (باوجود یہ کہ یہود کا علیٰحدہ قبلہ ہے اور نصاریٰ کا علیٰحدہ) اس وجہ سے مفرد لایا گیا کہ یہ دونوں باطل ہونے میں یکساں ہیں۔ تو اس حیثیت سے دونوں بمنزلۂ ایک قبلہ کے ہوگئے۔ الغرض وحی نے اپنے آغوش کے اندر اس بات کو محفوظ کر رکھا ہے، کہ مشرکین، یہود اور نصاریٰ کے قبلے انہی کے تجویز کردہ ہیں جن کی بطلان امور بدیہی میں سے ہیں۔

سمت قبلہ کی تعیین کی بابت مذکورہ بالا ادیان کا مختصر تنقیدی جائزہ

یوں تو کسی بھی دین کے پیروکار اپنے دین کی حقانیت کا دعویٰ کر سکتے ہیں اور کرتے بھی ہیں۔ مگر ان ادیان میں حق وباطل کے ادراک کے لیے معیار کی تعیین ایک ناگزیر اور ضروری چیز ہے جس کا سہارا لے کر تنقید کا راستہ ہموار ہو۔ پس اس مقصد کے لیے اگر عقل پر اکتفاء اور اعتماد کیا جائے تو وہ ناکافی ثابت ہوتی ہے کیونکہ:

(الف) عقل میں ایک تو کم وکیف کے اعتبار سے تفاوت مسلّم ہے۔ چنانچہ دیکھا جاتا ہے کہ بعض انسانوں میں عقل کا جوہر فراوانی سے موجود ہے اور وہ اس کے بل بوتے بہت سے باعثِ ترقی (دنیوی) امور سرانجام دیتے ہیں مثلاً حکومت، صنعت اور زندگی سے متعلقہ دیگر کام۔ مگر بعض افراد بشر عقل کی دولت دوسرے لوگوں کی بہ نسبت کچھ کم رکھتے ہیں۔

(ب) دوسری بات یہ کہ عوارض کی بنیاد پر عقل متاثر ہو کر اس کے فیصلے یکساں نہیں رہتے بلکہ بدل جاتے ہیں۔ مثلاً اعتدال کی حالت میں جو فیصلہ سرانجام ہو وہی فیصلہ غصے، شہوت، بڑھاپے اور بیماری کے موقعوں پر نہیں ہو سکتا۔

(ج) تیسری بات یہ کہ دینی امور (جن میں تعیینِ سمتِ قبلہ بھی داخل ہے) کا سرچشمہ حضرات انبیاء علیہم السلام ہیں۔ پس اگر ان امور میں فقط عقل کی مداخلت رہے تو پھر انبیاء علیہم السلام کی بعثت کا بے کار ہونا لازم آئے گا۔

ان امور میں غور کر کے اس نتیجے تک رسائی کوئی بعید نہیں کہ عقل اگرچہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک بیش بہا دولت اور قیمتی

سرمایہ ہے۔ مگر حق و باطل کی تعیین میں یہ خود کفیل نہیں۔ ورنہ یہی عقل تو تھی جس نے بعض عرب کو عریانی کی حالت میں بیت اللہ شریف کے طواف کرنے پر آمادہ کیا اور اس طرح طواف کو وہ افضل سمجھتے تھے۔ نیز بعض لوگ محض عقل کا سہارا لے کر آخرت کا انکار کر بیٹھے۔ الغرض فقط عقل کی رہنمائی ناکافی ہے بلکہ اس کے علاوہ ہمیں کوئی اور جوہر درکار ہے جس سے منزلِ مقصود تک رسائی صرف ممکن ہی نہیں بلکہ یقینی ہو۔ اور وہ جوہر ہے " وحی محفوظ " جو قرآن مجید اور فرقان حمید کے نام سے موسوم اور ہمارے پاس موجود ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے :

'' تبٰرک الذی نزّل الفــــرقان علیٰ عــــبدہٖ ''[48]

"بابرکت ہے وہ ذات جس نے اپنے خاص بندے (حضرت محمد ﷺ) پر (حق اور باطل کے درمیان) فرق اور تمیز کرنے والی کتاب نازل فرمائی"

اسی طرح حق و باطل کی نشاندہی کرنے میں جو مرتبہ قرآن مجید کا ہے وہی احادیث نبویہ کو بھی حاصل ہے۔

سمتِ تعیین کعبہ کے بابت اسلامی نقطۂ نظر اور اس کے نتائج

امتِ محمدیہ ﷺ جو ساری دنیا کے لیے امتِ عادلہ بناکر بھیجی جارہی تھی ، لازمی تھا کہ اس کی مرکزیت اور یکجہتی کے لیے ایک قبلہ بھی ہو۔ وہ قبلہ خانہ کعبہ مقرر ہوا اور مسلمانوں کو یہ حکم ملا کہ مشرق میں ہوں یا مغرب میں، شمال میں ہوں یا جنوب میں غرض کرۂ ارض کے کسی بھی خطہ میں رہنے والے اہلِ اسلام سفر وحضر میں نماز کے وقت کعبہ کی طرف رخ کریں۔ اور اسی کو قبلۂ عبادت سمجھیں۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے کہ :

'' فول وجھک شطــــر المسجد الحــــرام ''[49]

ترجمہ:(بوقت نماز) مسجد حرام کی طرف منہ پھیر دیا کریں۔

دوسری جگہ ارشاد ہے:

''وحیثما کنتــــم فولوا وجوھــکم شطــــرہ''[50]

" تم جہاں کہیں بھی ہو تو مسجد حرام کی طرف (حالت نماز میں) منہ کرتے رہنا"

مسلمانوں کا یہ قبلہ (کعبہ) اگرچہ گذشتہ بیشتر ادیان میں بھی اپنا تحفظ کرتا رہا ہے مگر شریعتِ محمدیہ میں اس کو خاص اہمیت، عموم اور تاکید حاصل ہے اور تاقیامت امت محمدیہ کے لیے یہی قبلۂ عبادت رہے گا۔

قبلۂ اسلام کا تاریخی پس منظر اور امتیازی خصوصیات

اس میں کوئی شک نہیں کہ قبلۂ اسلام (کعبۃ اللہ) پر مختلف ادوار گزرتے رہے مگر ہر دور میں یہ اپنے ماسوا دیگر تمام قبلوں کی بہ نسبت امتیازی شان کا حامل رہا ہے۔ یوں تو دین اسلام کی فوقیت، علوشان اور افتخار کے لیے اتنا بھی کافی ہے کہ ابدالآباد کے لیے اس کا قبلہ ہونا بذریعۂ وحی منتخب ہوا ہے۔ تاہم (بحیثیتِ مجموعی دیگر قبلوں کے مقابلے میں) کعبہ کی کچھ مزید خصوصیات ذیل میں ذکر کی جاتی ہیں تاکہ دین اسلام کی برتری اور عظمت خوب واضح ہو جائے۔

(أ) مؤرخین کی تصریح کے مطابق سرزمینِ عرب میں کئی سارے کعبے پائے جاتے تھے لیکن ہر کعبہ ان لوگوں کے ساتھ مختص ہوتا جو اس کے بانی اور موجد ہوا کرتے تھے۔ مگر "کعبہ مکرمہ" کا کیا کہیں؟ کہ یہ عظیم الشان قبلہ مخصوص افراد اور خاص علاقوں تک ہی محدود نہیں بلکہ ہفت اقلیم کے تمام افرادِ بشر کے لیے عام ہے۔

(ب) نیز دیگر کعبوں کی حالت یوں بیان کی جاتی ہے کہ وہ کعبے ان میں کیے جانے والے اعمال کے بعد وجود میں آئے لوگ اپنی اپنی مرضی کے مطابق کچھ اعمال کرتے رہتے پھر کچھ عرصہ کے بعد ان اعمال کے لیے کعبوں کے بنانے کا اہتمام ضروری سمجھا گیا۔ گویا ان کے ہاں "اعمال" اصل اور "کعبے" فرع تھے۔ ادھر قبلۂ اسلام کو دیکھیں کہ اعمال سے تو کیا" ایک روایت کے مطابق" اعمال کرنے والے انسانوں سے بھی دو ہزار سال پہلے صفحۂ ہستی پر رونما ہوا۔[51] اور بعد میں اس کے مطابق اور اس کے شایانِ شان اعمال کا انتخاب ہوا۔ گویا اعمال اسی کے بدولت وجود پذیر ہوئے ہیں۔

(ج) کعبہ کی ایک اور خصوصیت یہ بھی ہے کہ کہیں بھی" بیت اللہ" کا لفظ بولا جائے تو اس سے کعبہ ہی مراد لیا جاتا ہے۔ اور یہ مرتبہ وشہرت کسی اور قبلے کو حاصل نہیں۔

نتائج بحث

اس میں کوئی شک نہیں کہ احکام شرعیہ کے ثبوت کا اصل مدار" نصوصِ شرعیہ" ہیں لیکن اسی طرح اس میں بھی شبہ نہیں کہ باوجود اس کے پھر بھی ان احکام میں بہت سے مصالح اور اسرار بھی ہوا کرتے ہیں۔ اور احکام کے ثبوت کا مدار اگرچہ ان پر نہیں لیکن ان میں یہ خاصیت ضرور ہے کہ بعض طبائع کے لیے ان کا معلوم ہو جانا احکام شرعیہ میں مزید اطمینان پیدا ہونے کے لیے ایک درجہ میں معین ہوتا ہے۔ گو راسخ یقین والوں کو اس کی ضرورت نہیں لیکن ضعفاء کے لئے (اور خصوصاً دور جدید میں مغربی

تہذیب سے متاثر عام مسلمانوں کے لئے) تسلی بخش اور قوت بخش ضرور ہے۔ اسی وجہ سے مندرجہ ذیل سطور میں تعیین قبلہ کی بعض حکمتیں اور اسرار پیش کی جارہی ہیں۔

ا۔ ربِ کعبہ کی تعظیم کا ذریعہ

ظاہر ہے کہ اگر کوئی شخص کسی مکان کی طرف جاتا ہے تو مکین مقصود ہوتا ہے اور اس طرف کے جو آداب و نیاز بجالاتا ہے ہر شخص ان کو صاحب خانہ کے لیے سمجھتا ہے جیسے اگر کسی تخت نشین کے تخت کی طرف جھک کر سلام کریں تو وہ صاحب خانہ کو ہوتا ہے خود تخت کو نہیں۔ چنانچہ لفظ بیت اللہ اس جانب مشیر بھی ہے کہ خانہ مقصود نہیں بلکہ صاحب خانہ مقصود ہے۔[52] یعنی کعبہ کی طرف منہ کرنے سے تو بظاہر بیت اللہ کی تعظیم معلوم ہوتی ہے مگر در حقیقت اس سے مقصود ربِ کعبہ کی تعظیم و تکریم ہے اور اسی تعظیم کی خاطر کعبہ کو قبلہ بنادیا گیا ہے۔

۲۔ حکیمانہ انداز سے غیر اللہ سے توجہ ہٹانے کا ذریعہ

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے عہد میں لوگوں نے شرک اور بت پرستی میں ترقی کرکے کثرت سے غیر اللہ کے نام پر معابد، کنائس اور مندر تعمیر کیئے۔ اور متعدد عبادت خانوں کو آفتاب مشتری اور دوسرے سیارات کے نام سے (ان کی تعظیم کے لیے) منسوب کیا۔

ان کے نزدیک غیر مرئی اور غیر محسوس اقدس پر اپنی توجہ کو مرکوز کرنا تب تک قطعاً ناممکن تھا جب تک کسی ایسی ہستی کے نام پر (جو اس کا اوتار ہو اور اس میں حلول کئے ہوئے ہو یا اس کو اس کی ذاتِ اقدس سے غیر معمولی قرب حاصل ہو) کوئی ہیکل تعمیر کرکے اس کو قبلۂ توجہ قرار نہ دیا جائے۔ اس لیے انہی کی ذہنیت کو ملحوظ رکھ کر دفعِ حرج کے اصول پر اللہ تعالیٰ کی رحمتِ کاملہ نے کعبہ کو "بیت اللہ" سے موسوم کرکے اس کو قبلۂ نماز قرار دیا۔

۳۔ عبادات میں حصول خشوع کا ذریعہ

لوگوں میں پرانے زمانے سے یہ عادت اور طریقہ جاری ہے کہ جب کسی امیر و بادشاہ کی صفت و ثناء بیان کرتے ہیں تو اول اس کے روبرو کھڑے ہوتے ہیں اور پھر ثناء و مدح سرائی میں مشغول ہوتے ہیں۔ یہی امور پھر نماز میں عبادت قرار دیئے گئے۔ اور عبادت کی روح جو کہ خشوع و خضوع ہے اس کے لیے سکون درکار ہے کہ مختلف امور کی طرف التفات ہی نہ رہے۔ اور جب تک

عابد اپنی عبادت میں ایک معین و مقرر طرف کا التزام نہ کرے اس وقت تک یہ سکون حاصل نہیں ہو سکتا۔ اس وجہ سے نماز میں ایک خاص سمت مقرر ہوئی۔[53] الغرض اگر استقبال قبلہ نہ ہو تا تو عبادت بے جان اور بے روح ہوتی۔

۴۔ حصول یکسوئی

ظاہر کو باطن کے ساتھ ایک ایسا تعلق ہے کہ ظاہری یکجہتی اختیار کرنا باطنی توجہ کو یک طرف کر دینے میں مؤیّد، ممد اور معاون ثابت ہوتا ہے اس لیے نماز میں استقبال قبلہ لازم ہوا۔[54]

۵۔ حصول اتحاد، یگانگت اور مساوات

لازم ہے کہ جملہ خلائق اور ساری انسانیت کے لیے ایک معین اور مقرر قبلہ ہو، تاکہ ان کے ظاہری اتفاق کا باعث ہو اور ساتھ ساتھ جب باطنی عبادات کے انوار و برکات حاصل کرنے میں سب متفق ہو جائیں تو اس کی وجہ سے بڑے پیمانے پر دلی نورانیت حاصل ہو جائے جیسا کہ بہت سے چراغ کسی مکان میں ایک ہی جگہ روشن کئے جائیں تو ان سے بڑی روشنی حاصل ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جمعہ اور جماعتیں مشروع ہوئیں۔ چنانچہ پانچویں جماعتوں میں ایک محلہ کے لوگوں کا اجتماع، جمعہ میں ایک شہر کے لوگوں کا اتفاق اور حج میں تمام جہاں کے لوگوں کا اجتماع ہوتا ہے اور اس اتفاق و اجتماع میں خصوصیت سے عبادات کے انوار کو زیادہ کرنے کا اثر موجود ہے۔ چونکہ ساری دنیا کے لوگوں کا ایک مکان میں ہر وقت جمع ہونا مشکل اور ان کے دائرہ اختیار سے باہر ہے اس لیے اس مکان کی جہت کو اس مکان کے قائم مقام کر کے نماز میں اس کے استقبال کا حکم ہوا۔[55]

۶۔ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت محمد ﷺ کی خدمات کی یاد دہانی کا ذریعہ

حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ فرماتے ہیں:

بہت واضح امر ہے اور حقیقت شناس عقل کے نزدیک کچھ بھی محل اعتراض نہیں کہ اس ہادی کو تمام دنیا کی متعارف عبادت کے طریقوں سے (جن میں شرک اور مخلوق پرستی کے جزاعظم شامل تھے۔) اپنے طریقِ عبادت کو خالص کرنا منظور تھا اور ایک واضح اور مختار مسلک قائم کرنا ضرور تھا۔ اس لیے واجب اور لازم ہوا کہ وہ اپنی امت کے ظاہری رخ کو بھی ایسی سمت کی طرف پھیر دے جس سے روحانی قوتیں حرکت میں آئیں۔ ہر ایک مسلمان کو یقین ہے کہ مکہ میں بیت اللہ کو توحید کے ایک بڑے واعظ نے تعمیر کیا اور بعد کے زمانے میں اسی کی اولاد میں سے ایک زبردست "کامل نبی"، مکمل شریعت لے کر ظاہر ہوا جس نے اس پہلی تلقین و تعلیم کو پھر زندہ اور کامل کیا پس نماز میں جب ادھر کو رخ کرتے ہیں تو یہ تمام تصورات آنکھوں میں پھر جاتے ہیں اور اس "مصلحِ عالم" کی تمام خدمات اور جانفشانیاں جو اس نے اعلاء کلمۃ اللہ میں دکھلائیں۔ یاد آجاتی ہیں۔[56]

حواشی و مراجع

[1]۔ مقاییس اللغہ، ج۶، ص۷۶

[2]۔ القلیوبی، شہاب الدین، حاشیتا قلیوبی علیٰ شرح جلال الدین المحلی، ج۱، ص۱۵۱، دار الفکر بیروت، ۱۴۱۹ھ

[3]۔ ابن نجیمؒ، زین الدین بن ابراھیم، البحر الرائق، ج۱، ۴۹۵، دار المعرفہ بیروت (س۔ن) و الحصکفی، محمد علاء الدین، الدر المختار، شرح تنویر الابصار، ج۲، ۱۱۴، دار الفکر بیروت، ۱۲۸۶ھ ۳۔

[4]۔ الکاسانی، ابو بکر بن مسعود بن احمد، بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع، ج۱، ص۳۱۴، مکتبہ علمیہ، بیروت، (س۔ن)

[5]۔ ایضاً

[6]۔ ایضاً

[7]۔ البقرۃ:۱۴۸

[8]۔ الرازی، فخر الدین محمد بن عمر، مفاتیح الغیب، ج:۲/ ۱۱۴، ۱۱۳ دار الکتب العلمیۃ، بیروت، ۲۰۰۰م

[9]۔ ابو العباس محمد بن یعقوب بن یوسف بن معقل بن سنان امام، محدث اور صوفی بزرگ تھے۔ آپ کے والد اسحاق بن راہویہ کے اصحاب میں سے تھے۔ آپ حسن الخلق، سخیّ النفس اور اپنے ہاتھوں کی کمائی کھاتے تھے۔ اصم کی وجہ تسمیہ آپ کا بہرہ پن ہے۔ آپ نے کئی علاقوں کی علمی اسفار طے کئے۔ جن میں اصفہان، بصریٰ، مکہ مکرمہ، مصر اور بیروت شامل ہیں۔ آپ کی وفات ۳۴۶ھ ہے (سیر اعلام النبلاً ۱۵:۴۵۳، تاریخ ابن عساکر ۱۶:۱۶۸۔ المنتظم ۶:۳۸۶۔ شذرات االذہب ۴:۲۴۳)

[10]۔ بنوری، محمد یوسف، معارف السنن، ج۲، ص۸۷، ایچ ایم سعید کمپنی کراچی (س۔ن)

[11]۔ صحیح المسلم، کتاب الفتن و أشراط الساعۃ (۵۲) باب لا تقوم االساعۃ حتی تعبد دوس ذا الخلعتۃ (۱۷) حدیث:۵۲(۲۹۰۷))

[12]۔ الزمر:۳

[13]۔ الصافات:۱۵۹۔۱۵۸

[14]۔ الانعام:۱۰۰

[15]۔ الانعام:۱۲۸

[16]۔ حمٓ السجدۃ :۳۷

[17]۔ النجم:۴۹

[18]۔ النحل:۲۰۔۲۱

[19]۔ البقرۃ:۱۷۷

[20]۔ الآلوسی، شہاب الدین محمود بن عبد اللہ، روح المعانی فی تفسیر القرآن العظیم والسبع المثانی، ج۲، ص۴۵، دار الکتب العلمیۃ، بیروت، ۱۴۱۵ ہجری

[21]۔ محدث، شاہ ولی اللہ، البدور البازغۃ، ص۲۷۳، سندھ بساگرہ اکیڈمی لاہور، (س۔ن)

[22]۔ عبد الماجد دریابادیؒ، القرآن الحکیم مع ترجمہ و تفسیر، ص:۲۷۳، تاج کمپنی لمیٹڈ لاہور کراچی۔

[23]۔ تفسیر مظہری، ج ۱/۱۴۵۔

[24]۔ ایضاً

[25]۔ روح المعانی فی تفسیر القرآن العظیم والسبع المثانی، ج ۲/۱۱

[26]۔(قرآن کی آیت مبارکہ (ان یاتیکم التابوت فیہ سکینۃ من ربکم) (البقرۃ:۲۴۸) میں اس صندوق کا تذکرہ آیا ہے۔ یہ وہ صندوق ہے جو اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام پر جنت سے اتارا تھا۔ اس میں مندرجہ ذیل چیزیں تھیں:

۱۔ انبیاء علیہم السلام اور ان کے گھروں کی تصویریں

۲۔ حضور ﷺ کا گھر تو اس کے اندر سرخ یاقوت کی شکل میں موجود تھا جس میں آپ کھڑے ہو کر نماز پڑھتے ہوئے نظر آتے تھے اور ان کے ارد گرد صحابہ دکھائی دیتے تھے۔

۳۔ بعد کے زمانہ میں تورات کی تختیوں کے کچھ ٹکڑے

۴۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے جوتے مبارک اور لاٹھی

۵۔ حضرت ہارون علیہ السلام کا عمامہ اور ایک پیمانہ۔

[27]۔ حضور ﷺ کا گھر تو اس کے اندر سرخ یاقوت کی شکل میں موجود تھا جس میں آپ کھڑے ہو کر نماز پڑھتے ہوئے نظر آتے تھے اور ان کے ارد گرد صحابہ دکھائی دیتے تھے۔

[28]۔بعد کے زمانہ میں تورات کی تختیوں کے کچھ ٹکڑے

[29]۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے جوتے مبارک اور لاٹھی

[30]۔ یہ صندوق شمشاد (ایک لمبا خوبصورت درخت ہے۔) کی لکڑی سے بنا ہوا تھا جس کی لمبائی تین گز اور چوڑائی دو گز تھی۔ اور نسل در نسل بنی اسرائیل تک پہنچا۔ ملاحظہ ہو (تفسیر جلالین اور حاشیۃ الجمل، قدیمی کتب خانہ مقابل آرام باغ کراچی، ج ۱/۳۰۵،۳۰۴) کی طرف نماز پڑھتے جو وہ اپنے ہمراہ سفر میں لے جاتے تھے۔ ہاں جب بیت المقدس واپس آجاتے تو مسجدِ اقصیٰ کی چٹان (یہ وہی چٹان جس سے فرشتے آسمان پر چڑھتے ہیں اور قبلۂ ابراہیمی کے علاوہ دوسرا قبلہ بھی یہی رہا ہے۔ دیکھئے (تفسیر روح البیان، داراحیاء التراث العربی، جزو ثانی/۳۴۹)

[31]۔ جب بنی اسرائیل نے اللہ کی نافرمانیاں اور قربانی میں بدعتیں شروع کیں اور بیت المقدس میں بدافعالیاں کرنے لگے تو یہ تابوت (صندوق) ان کے ہاں سے ناپید اور معدوم ہو گیا۔ معدوم ہونے کی مختلف صورتیں بتائی جاتی ہیں: حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ اسے آسمان پر اٹھالیا گیا تھا۔ اور بعض کا قول ہے کہ ان پر دشمن (عمالقہ) غالب آکر وہ صندوق اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ حقیقتِ حال جو بھی ہو بہر حال یہ واقعہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات سے کافی عرصہ بعد وجود پذیر ہوا (۔ تفصیل کے لیے دیکھئے:

(ا) ارشاد العقل السلیم الی مزایا القرآن الکریم للامام ابی السعود العمادیؒ، داراحیاء التراث العربی، ج ۱/۳۴۱

(ب) غرائب القرآن ورغائب الفرقان للعلامہ نظام الدین حسن النیسابوریؒ، دارالکتب العلمیہ بیروت، ج ۱/۲۶۷

(ج) قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ کی تفسیر مظہری، ج ۱/۳۹۴،۳۹۳، دارالاشاعت کراچی

[32]۔ روح المعانی فی تفسیر القرآن العظیم والسبع المثانی، ج ۲/۱۱۔

[33]۔ حٰم السجدۃ:۳۸

[34]۔ الحج:۱۷

[35]۔لقمان:۱۳

[36]۔ابراہیم:۳۰

[37]۔دیوان علیؓ،ص:۳۵

[38]۔الجاثیۃ:۲۳

[39]۔ ایضاً

[40]۔روح المعانی فی تفسیر القرآن العظیم والسبع المثانی،،ج ۲/۱۱۔

[41]۔روح المعانی فی تفسیر القرآن العظیم والسبع المثانی،،ج ۲/۱۱۔

[42]۔ البغدادی، علاء الدین علی بن محمد، تفسیر الخازن(لباب التاویل فی معانی التنزیل،،ج ۱/۱۵۴، دارالکتب العلمیہ بیروت،۱۴۱۵)

[43]۔ القاسمی، محمد جلال الدین، محاسن التاویل، المعروف بہ تفسیر قاسمی،ج ۲/۵۲۴، مکتبۃ مکۃ المکرمہ،(س۔ن)

[44]۔یونس:۳۲

[45]۔البقرۃ :۱۴۵

[46]۔البقرۃ :۱۴۵

[47]۔البقرۃ :۱۴۵

[48]۔ الفرقان:۱

[49]۔ البقرہ:۱۴۴۔

[50]۔ البقرہ:۱۵۰

[51]۔روح المعانی،ج ۲،ص ۱۱

[52]۔ تھانوی، اشرف علی، احکام اسلام عقل کی نظر میں، ص ۵۴،۵۳، دار الاشاعت کراچی

[53]۔ شیخ علی احمد الجرجاوی، حکمۃ التشریع وفلسفۃ، کتب خانہ رشیدیہ پشاور، ج ۲، ۲۵۸

[54]۔ قرطبیؒ، ابو عبداللہ محمد بن احمد، الجامع لاحکام القرآن، دارالکتب المصریۃ، القاھرۃ، ج ۴، ۱۳۹، نیز امام ابن جریر طبریؒ، جامع البیان، دارالفکر، ج ۴، ۱۷

[55]۔ روح المعانی فی تفسیر القرآن العظیم والسبع المثانی، مکتبہ امدایہ ملتان، ج ۳، ۷،۶

[56]۔ تھانوی، اشرف علی، بوادر النوادر، ج ۲، ص ۱۷۷، مکتبہ دیوبند(س۔ن)